E-Content

Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India

Subject / Course - M.A. Urdu

Paper : **02.** Masnavi, Marsiya Aur Nazm

Module Name/Title : Kalam e Faiz Alamati Shayeri Ka Shahkar

DEVELOPMENT TEAM	
CONTENT	DDE, MANUU / Dr. Syed Taqi Abedi
PRESENTATION	Dr. Syed Taqi Abedi
PRODUCER	Md. Mujahid Ali

Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India
//imcmanuu

اکائی: 26 فیضؔ: حیات، کارنامے اور نظم نگاری

ساخت

26.1 تمہید
26.2 حیات
26.3 کارنامے
26.4 نظم نگاری
26.4.1 اسلوبِ سخن
26.5 نظم: مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
26.5.1 نظم مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ کا تجزیہ
26.6 نظم: نثار میں تیری گلیوں کے......
26.6.1 نظم: نثار میں تیری گلیوں کے...... کا تجزیہ
26.7 نظم: شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
26.7.1 نظم: شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کا تجزیہ
26.8 خلاصہ
26.9 نمونہ امتحانی سوالات
26.10 فرہنگ
26.11 سفارش کردہ کتابیں

26.1 تمہید

فیض احمد فیض عصر جدید کے مقبول شاعر ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعر ہیں۔ اس اکائی میں فیض احمد فیض کے حالات زندگی، کارنامے نظم نگاری کی خصوصیات اور منتخب نظموں کی تشریح کا مطالعہ کریں گے۔

26.2 حیات

فیض احمد فیضؔ کا نام فیض احمد خاں تھا۔ پردادا کا نام سربلند اور دادا کا نام صاحب زادہ خاں تھا۔ فیض کی بہن بی بی گل کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں ایک راج پوت راجہ ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام سین پال تھا اور اس کا تعلق سہارن پور سے تھا۔ اس کی اولاد میں سے ایک نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے والد کا تعلق اسی شاخ سے ہے۔ فیض کے والد کا نام سلطان بخش تھا لیکن انھوں نے خود اپنا نام بدل کر سلطان محمد خاں کر لیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ سلطان محمد خاں نے افغانستان میں 13 برس ملازمت کی اور امیر عبدالرحمٰن کی بھتیجی اور سردار محمد رفیع خاں کی بیٹی سائر خاں سے شادی کی لیکن شادی کے دو سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ سلطان محمد خاں شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی بھانجی ڈاکٹر مس ہملٹن نے اپنے ایک ناول میں ان کا ذکر کیا ہے۔ افغانستان سے آنے کے بعد سلطان محمد خاں نے لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور سیال کوٹ کے مشہور بیرسٹر بن گئے۔ علامہ اقبالؔ، سر عبدالقادر، ڈاکٹر ضیاالدین، علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ادبی شخصیتوں کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارا تھا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر، انجمن اسلامیہ

سیال کوٹ کے صدر؛ اور انجمن حمایت الاسلام کی انتظامیہ کے سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے افغانستان کے دستوری قوانین اور امیر عبدالرحمٰن کی سوانح عمری انگریزی میں لکھی تھی۔ اپنی بیوی کے انتقال کے بعد انھوں نے عدالت خاں کی صاحبزادی سلطان فاطمہ سے دوسری شادی کی۔ فیض ان ہی سے پیدا ہوئے۔ اپنی تاریخ پیدائش کے بارے میں فیض کہتے ہیں۔

''تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں 7 جنوری 1911ء اور کہیں 7 جنوری 1912ء درج ہے۔ سیال کوٹ کے دفتر بلدیہ کے ریکارڈ میں 13 فروری 1911ء تاریخ پیدائش درج ہے۔''

فیض قصبہ قادر، ضلع سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے زمانے میں فیض نے بڑی خوش حال زندگی گزاری۔ فیض نے اپنی تعلیم کا آغاز 1915ء میں چار سال کی عمر میں قرآن پاک کے حفظ سے کیا۔ (صرف تین پارے حفظ کر سکے آنکھیں دکھنے لگیں تو حفظ کرنا چھوڑ دیا) 1916ء میں مولوی ابراہیم سیال کوٹی کے مکتب میں بٹھا دیے گئے جہاں انھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ 1921ء میں لاہور کے ایک مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ 1927ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ 1929ء میں مرے کالج آف سیال کوٹ سے انٹرمیڈیٹ بھی درجہ اول سے کامیاب کیا۔ 1931ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور عربی میں بی۔ اے آنرز کیا۔ اس کے بعد 1933ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم۔ اے اور 1934ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم۔ اے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ اس طرح فیض کا پورا تعلیمی کیریر فرسٹ کلاس ہے۔ والد کے کہنے پر آئی۔ سی ایس کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ امتحان سے پہلے انھیں ہیضہ ہوگیا۔ اس لیے امتحان نہ دے سکے۔ 1934ء میں تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔ 1935 میں امرتسر کے مسلم اینگلو اورینٹل کالج (ایم۔ اے۔ او) میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرر ہوا۔ 1940ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔

فیض احمد فیض نے ایک انگریز خاتون مس ایلیس جارج سے باقاعدہ اسلامی طریقے سے شادی کی۔ ایلیس جارج، کرسٹنا بیل کی چھوٹی بہن تھیں۔ کرسٹنا بیل ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی بیوی تھیں جو ایم۔ اے۔ او کالج کے پرنسپل تھے۔ شیخ عبداللہ نے مہاراجہ کشمیر کے محل میں ان کا نکاح پڑھوایا۔ فیض کی شادی عجیب ڈھنگ سے کشمیر میں ہوئی۔ بارات میں صرف دو آدمی تھے۔ فیض کے بڑے بھائی طفیل احمد خاں اور فیض کے ایک دوست نعیم۔ نکاح کے بعد بیگم و شیخ عبداللہ نے دولہا دلہن کی دعوت کی، دعوت کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں جوش اور مجاز نے شرکت کی۔ تین دن قیام کے بعد فیض اور ان کی بیگم لاہور آ گئے۔ فیض کے والد نے ایلس کو باضابطہ دلہن بنایا اور ان کا نام کلثوم رکھا۔ فیض کی اولاد میں دو لڑکیاں ہیں۔ پہلی بیٹی سلیمہ 1942ء میں اور چھوٹی بیٹی منیزہ 1945ء میں پیدا ہوئیں۔

1942ء میں درس و تدریس کے پیشے کو خیر باد کہا اور فوج میں ملازمت اختیار کی۔ کیپٹن کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ وہ لاہور سے دہلی آ گئے۔ ان کا تعلق فوج کے شعبہ تعلقات عامہ سے تھا۔ 1943ء میں میجر اور 1944ء میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1947ء میں فوج سے استعفیٰ دے کر لاہور چلے گئے۔ یہاں انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد روزنامہ ''امروز'' کے ایڈیٹر اور ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔

قیام پاکستان کے تقریباً تین برس بعد 1951ء میں لیاقت علی خاں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے فوجی افسر اور ترقی پسند تحریک کی اہم شخصیت سجاد ظہیر بھی گرفتار ہو گئے۔ یہ کیس ''راول پنڈی سازش مقدمہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ فیض نے چار سال ایک ماہ گیارہ دن قید کی صعوبتیں اٹھائیں۔ تقریباً تین مہینے قید تنہائی کی سزا ہوئی۔ فیض کی بیشتر نظمیں ان کے زمانہ قید کی یادگار ہیں۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

20 اپریل 1955ء کو قید سے رہا ہوئے۔ دوسری بار 1958ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور اپریل 1959ء میں رہائی ملی۔ اپریل

1959 میں فیض پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری مقرر ہوئے۔اس خدمت پر وہ جون 1962ء تک فائز رہے۔اس کے بعد وہ لندن چلے گئے ۔1964ء میں فیض سر عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ستمبر 1968ء میں کراچی میں ادارہ یادگار غالب قائم کیا اور علامہ اقبال پر فلم بنائی۔ 1972ء میں فیض پاکستانی قومی ادبی اکیڈیمی کے صدر مقرر ہوئے۔1979ء میں بیروت کے انگریزی رسالے''لوٹس'' کے ایڈیٹر بنے۔1981ء میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر جشن فیض منایا گیا۔1984ء میں لندن میں فیض سمینار ہوا جس میں فیض بذات خود شریک ہوئے۔

19 نومبر 1984ء کو ان پر دمے کا شدید دورا پڑا۔انھیں لاہور کے ماڈل ہاسپٹل میں داخل کیا گیا جہاں ایسٹ میڈیکل وارڈ میں 20 نومبر 1984ء بروز منگل دن میں ایک بج کر پندرہ منٹ پر ان کا انتقال ہو گیا۔لاہور کے ماڈل ٹاؤن قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔فیض کی تقریباً پندرہ شعری و نثری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

شعری مجموعے

(1) نقش فریادی (1941) (2) دست صبا (1952) (3) زنداں نامہ (1956) (4) دست تہہ سنگ (1965) (5) سر وادی سینا (1971) (6) شام شہر یاراں (1978) (7) میرے دل میرے مسافر (1981) (8) کلام فیض (1982) (9) سارے سخن ہمارے (فیض کا تمام کلام ''کلیات'' کی صورت میں لندن سے شائع ہوا) (1984) (10) نسخہ ہائے وفا (سارے سخن ہمارے کا پاکستانی ایڈیشن) 1984

نثری مجموعے

(1) میزان (تنقیدی مضامین) 1962 (2) صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط) 1971 (3) متاع لوح و قلم (1973) (4) ہماری قومی ثقافت (1976) (5) مہ و سال آشنائی (1980) (6) سفر نامہ کیوبا (1974)

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فیض کی صحیح تاریخ پیدائش کیا ہے؟
2. فیض کا مقام پیدائش (1) سیالکوٹ (2) کراچی (3) جالندھر
3. فیض کی پندرہ تصانیف میں سے دو شعری مجموعوں کے نام لکھیے۔

26.3 کارنامے

فیض تعلیم ختم کرنے کے بعد جب امرتسر آئے تو ان کی ملاقات پطرس بخاری، رشید جہاں، ہاجرہ بیگم، ڈاکٹر محمود الظفر اور دوسرے کمیونسٹ رہنماؤں سے ہوئی۔فیض اپنے پہلے عشق میں ناکام ہو کر بہت دل برداشتہ تھے۔رشید جہاں نے اسے محسوس کیا اور کہا کہ یہ حادثہ تمہاری ذات واحد کا بہت بڑا حادثہ ہو سکتا ہے مگر یہ اتنا بڑا نہیں ہو سکتا کہ زندگی بے معنی ہو جائے۔انھوں نے فیض کو پڑھنے کے لیے ایک کتاب دی جو کارل مارکس کی تھی۔بقول فیض 'انھوں نے اس کتاب کو پڑھا اور ان پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔اشتراکی ادب کے مطالعے نے انھیں سوشلزم کی طرف مائل کیا۔فیض نے ان لوگوں کے ساتھ مل کر ریلوے اور ڈاک وتار کے مزدوروں کو منظم کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔قیام پاکستان کے بعد فیض ٹریڈ یونین کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔سجاد ظہیر کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں حصہ لیا۔فیض نے جینوا اور سان فرانسسکو میں منعقدہ آئی۔ایل۔او کے اجلاس میں شرکت کی۔فیض نے اپنے ملکی مسائل کے علاوہ فلسطین مہاجرین اور افریقی عوام کی آزادی کی تحریک میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔فیض کا تعلق فلموں سے بھی رہا۔انہوں نے دو فلموں کے لیے گانے اور مکالمے لکھے۔ایک فلم 'جاگو ہوا سویرا' جو 1959ء میں نمائش کے لیے پیش ہوئی اس فلم کو بین الاقوامی اعزاز بھی مل چکا ہے۔

فیض نے ایشیا اور یورپ کے بہت سے ممالک کے دورے کیے 49-1948 تک سان فرانسسکو اور جینوا میں رہے۔جولائی 1962ء سے جنوری 1964ء کے دوران انگلستان، روس، الجیریا، مصر، لبنان اور ہنگری کا سفر کیا۔1958ء میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی پہلی کانفرنس تاشقند میں ہوئی جس میں فیض صاحب نے ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔

فیض کو فوجی ملازمت کے دوران 1946ء میں ایم۔بی۔ای کا خطاب ملا۔1962ء میں فیض کو پہلا لینن انعام ملا۔فیض پہلے ایشیائی شاعر تھے

جنھیں یہ اعزاز دیا گیا۔اس سے فیض کو نہ صرف بین الاقوامی شہرت ملی بلکہ اردو زبان کا وقار بھی بلند ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. امرتسر میں فیض کی ملاقات کن شخصیتوں سے ہوئی ؟
2. فیض نے کس فلم کے گانے لکھے؟
3. فیض پہلے ایشائی شاعر تھے جنھیں یہ اعزاز دیا گیا۔

(1) نوبل انعام (2) لینن انعام (3) ہلال پاکستان

26.4 نظم نگاری

1928ء میں جب فیض بی۔اے فرسٹ ایر میں تھے شعر کہنے لگے تھے۔مرے کالج سیال کوٹ کے لکچرر محمد سلیم چشتی جو اقبال کے ہم عصر تھے بی۔اے کے طلبا کو اردو پڑھاتے تھے۔چشتی صاحب نے ایک گروپ ''اخوان الصفا'' کے نام سے بنایا تھا جس کے زیر اہتمام ہر ماہ کالج میں ایک محفل شعر منعقد کی جاتی تھی۔اس کے پہلے مشاعرے کے لیے یہ مصرع طرح تجویز کیا گیا تھا۔ع غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا

نومبر 1928ء کے پہلے ہفتے میں منعقد ہونے والی اس پہلی محفل میں فیض نے پہلی بار غزل پڑھی۔

لب بند ہیں ساقی میری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جومنت کش صہبا نہیں ہوتا

یہ شعر کافی مقبول ہوا۔ان کی پہلی نظم ''میرے معصوم قاتل'' گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین دسمبر 1929ء میں شائع ہوئی۔اس کے بعد ان کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہوتا رہا۔فیض کا پہلا شعری مجموعہ ''نقش فریادی'' 1941ء میں شائع ہوا۔اس میں فیض نے دیباچے میں اعتراف کیا:

''اس مجموعہ کی اشاعت ایک طرح کا اعتراف شکست ہے۔شاید اس میں دو چار نظمیں قابل برداشت ہیں لیکن دو چار نظموں کو کتابی صورت میں شائع کروانا ممکن نہیں تھا۔اصولاً مجھے انتظار کرنا چاہیے تھا کہ ایسی نظمیں کافی تعداد میں جمع ہو جائیں لیکن یہ انتظار کچھ عبث معلوم ہونے لگا۔''

لیکن یہ بات فیض نے اپنے انکسار کی وجہ سے کہی تھی۔ان کا پہلا مجموعہ کافی مقبول ہوا۔اس پر انھوں نے ن۔م۔راشد سے مقدمہ لکھوایا تھا۔راشد نے لکھا تھا:

''نقش فریادی ایک ایسے شاعر کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔''

ن۔م۔راشد کا یہ جملہ فیض کی شاعری کا ''سرنامہ'' ثابت ہوا۔

فیض کی شاعری میں رومان وحقیقت کی دھوپ چھاؤں ابتدا سے انتہا تک موجود ہے۔ان کی شاعری میں حسن ومحبت کی دل گداز داستانیں بھی ہیں اور بیزار نگاہوں کی تلخی بھی۔ان میں حسن کی رنگینی میں کھو جانے کی جرات بھی ہے اور اجنبی ہو جانے کی تمنا بھی ہے۔یہ اپنے عہد سے مایوس ہیں لیکن شکست خوردہ نہیں۔ان کی شاعری میں تفکر آمیز تجسس ہے۔وہ جانتے ہیں کہ غلامی کا یہ اندھیرا چند روزہ ہے۔اس کے لیے وہ ہر ستم سہنے کے لیے تیار ہیں۔فیض کے مزاج میں رومانیت ہے۔یہ رومانیت انھیں خالص انقلابی بننے سے روکتی ہے۔ان کی انقلابیت میں رومانیت کے عناصر شامل ہوتے رہے اور اسی لیے وہ رومان اور حقیقت کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔فیض نے اپنی زندگی میں محبت کی تھی اور ناکام ہوئے تھے۔ان کا محبوب ان کی مختلف نظموں اور غزلوں سے جھلکتا رہا۔

فیض کی نظموں میں یہ محبوب بار بار نظر آتا ہے لیکن یہ خیالی اور تصوراتی محبوب نہیں ہے بلکہ جیتا جاگتا محبوب ہے جس سے انھوں نے بے پناہ پیار کیا تھا۔یہ محبوب متوسط طبقے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ کسی اونچے گھرانے سے متعلق ہے۔فیض انتظار کرواتے نہیں بلکہ انتظار کرتے ہیں۔فیض کی ابتدائی

شاعری میں تنہائی اور انتظار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ فیض کی روح تنہائی کا شکار ہے۔ وہ گردوپیش کے ماحول کو اکتائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اُن کا دل اچاٹ ہے، وہ پرانی زوال پذیر قدروں سے مایوس ہیں۔ انھیں انتظار ہے۔ اپنے محبوب کا 'کسی رنگین آنچل کا' گھنے درختوں پہ سوئی ہوئی چاندنی کا اور عہدنو کا جس پر ان کا یقین ہے۔ ان کی تنہائی لمحہ بہ لمحہ بوجھل ہوتی جاتی ہے لیکن وہ مایوس نہیں ہیں۔ یہ نظمیں اپنا ایک انفرادی وجود رکھتے ہوئے بھی ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ نقش فریادی کی پہلی نظم ''خدا وہ وقت نہ لائے'' میں بھی انتظار ہے۔ وہ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں:

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہوتو
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے

اور آخر میں

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے
وہ دل کہ بیقرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

اس نظم میں فیض اپنے محبوب کو آنے والے وقت کا خوف بھی دلاتے ہیں اور اپنے دل کی بے قراری کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ فیض کی شاعری میں فراق اور جدائی کا سوز گھلاوٹ اور لذت ہے۔ فیض کے انتظار میں درد کی کسک ہے' امید کی ٹیسیں ہیں۔ فیض کی شاعری میں تنہائی اور انتظار مختلف روپ اختیار کرتے ہیں۔

ان نظموں کی ایک خاص فضا ہے۔ ایک غم انگیز خامشی ہے۔ فیض کی شاعری کا سارا حسن فضا سے جھلکتا ہے۔ وہ ایک ایسی فضا کی تعمیر کرتے ہیں جہاں مصرعوں کی معنویت اہم نہیں رہ جاتی۔ اس فضا میں الفاظ موم کی طرح پگھل کر بہنے لگتے ہیں۔ ایک سناٹا سا محسوس ہوتا ہے اور تنہائی روح کی گہرائیوں میں اترتی محسوس ہوتی ہے اور سارا وجود سرتا پا انتظار بن جاتا ہے۔ فیض نے دو نظمیں ''تنہائی'' اور ''انتظار'' کے عنوان سے لکھی ہیں۔

نظم ''انتظار'' میں وہی اشتیاق ہے جو ہر شاعر کو اپنی محبوبہ کا ہوتا ہے۔ اس نظم میں وہ کوئی خاص فضا نہیں بنا سکے۔ صرف اپنے عام احساسات کا اظہار کرتے ہیں:

جو حسرتیں تیرے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں

نظم کے اختتام پر ایسا لگتا ہے جیسے شاعر بہت تھک کر نڈھال ہو گیا ہو۔ ایک خودسپردگی کی کیفیت' شکست کا اعتراف اور ملتجیانہ انداز ابھر کے آتا ہے:

قسم تمھاری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویٔ صبر و شکیب آجاؤ
قرارِ خاطرِ بے تاب' تھک گیا ہوں میں

نظم ''تنہائی'' معنوی اور فنی اعتبار سے فیض کی اہم نظم ہے۔ یہ نظم داخلیت کا اظہار ہے۔ یہ نظم آرتھر سائمن کی Broken Trust یا ہارڈی ن م The Broken Appointment کی یاد دلاتی ہے۔ شاعر کا سارا وجود سمٹ کر انتظار کے نقطے پر مرکوز ہے۔ خفیف سی خفیف آہٹ پر وہ چونک اٹھتا ہے۔ اسے اپنے محبوب کے قدموں کی آہٹ کا دھوکا ہوتا ہے۔ امید وبیم کی کیفیت ہے۔ امید کی لو ٹمٹمار ہی ہے۔ پھر وہ بھڑک اٹھتی ہے اور پھر بجھ جاتی ہے۔

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

نظم کے پہلے مصرعے میں شاعر کا وجود ساری دنیا سے بے خبر ہے۔ وہ ہم کلامی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ دوسرے مصرعے میں اسے خیال آتا ہے کہ کوئی راہرو ہوگا جو کہیں اور چلا جائے گا۔ پھر انتظار کی شدت مایوسی میں بدلتی جاتی ہے۔ مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔ رات ڈھل چکی ہے۔ تاروں کا غبار بکھرنے لگا ہے۔ ایوانوں کے خوابیدہ چراغ لڑکھڑانے لگے ہیں۔ اسے یقین ہوتا جارہا ہے کہ اب کوئی آنے والا نہیں ہے اس لیے وہ شمعیں گل کرنے، مے و مینا وایاغ بڑھا دینے اور بے خواب کواڑوں کو مقفل کرنے کی التجا کرتا ہے۔ کوئی نہیں کوئی نہیں کی تکرار انتہائی مایوسی کا اظہار بن جاتی ہے۔ یہ نظم کسی بھڑکتی ہوئی شمع کے بجھنے کی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔ سارے حواس کو بیدار کرتی ہے۔ پہلے قوت شامہ بیدار ہوتی ہے۔ ہر آہٹ پر کان لگے ہوئے ہیں۔ پھر بصارت کی حس کو چھوتی ہے رات' تاروں کا غبار' چراغ...... پھر مذوقی حس کو جگاتی ہے' مے' مینا وایاغ سے...... پھر بے خواب کواڑوں کو مقفل کرنے کا عمل لمسی احساس پیدا کرتا ہے۔ اس طرح یہ ساری حسیں انتظار سے مایوسی کی طرف گامزن ہوتی ہیں۔

بعض نقادوں نے اسے جہان نو کا انتظار قرار دیا ہے۔ ن۔م۔راشد نے تاروں کے بکھرے ہوئے غبار اور ایوانوں کے لڑکھڑاتے چراغ کا مطلب تہذیب کا بکھرتا شیرازہ لیا ہے۔ لیکن یہ مطالب دوراز کار معلوم ہوتے ہیں۔

فیض اپنے عہد کی حقیقت کا سامنا کرتے ہیں اور خوابوں کی شکست کے المیے کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ رومانی افسردگی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہلکی سی کسک' میٹھا میٹھا درد' پرلطف تڑپ اور محبوب کی چاہت میں شدت ہے۔ وہ چپکے چپکے آنسو بہاتے ہیں اور محبوب کے تغافل کے باوجود اسے چاہتے اور دعائیں دیتے ہیں:

راتوں کی خموشی میں
چھپ کر کبھی رو لینا
مجبور جوانی کے
ملبوس کو دھو لینا

جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے بسا لینا
بھولی ہوئی یادوں کو
سینے سے لگا لینا

(انتہائے کار)

فیض کی رومانی شاعری عشق کی مدہوشیوں اور جسم کی لذت کوشیوں کا بیان نہیں ہے۔ فیض کے ہاں وصل کی سرشاری نہیں بلکہ جدائی کی خاموش

تڑپ ہے۔ یہ شاعری ایک ایسے شخص کے آنسوؤں وآہوں کی داستان ہے جسے اس بات کا احساس کھائے جا رہا ہے کہ زندگی چندروزہ ہے اور شباب اس سے بھی زیادہ چندروزہ ہے:

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شباب

(سرودِشبانہ)

''سرودِشبانہ''۔''تہہ نجوم''۔''یاس'' اور''ایک منظر'' فیض کی فن کاری اور مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان نظموں میں ایک پر اسرار خاموشی اور معنی خیز سرگوشی ہے۔ پرسکون اور خواب آور مناظر شاعر کی روح کی طرح بوجھل اور نڈھال ہیں۔ لیکن ان مناظر کی افسردگی اور اضمحلال میں سرگوشیاں سنائی پڑتی ہیں۔ ان نظموں میں شاہراہوں کا تجسس ہے اور یہی نظمیں اس عبوری دور کی نشانی ہیں جہاں شاعر،شاعرِ محبت سے شاعرِ انسان بنتا ہے۔ ان نظموں کا حسن و سکون آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔''سرودِشبانہ'' میں شاعر نہ صرف عالم خودفراموشی میں ہے بلکہ اس کے وجود کا ذرہ ذرہ اپنے گرد وپیش کے منظر سے ہم آہنگ ہے۔

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
ساز دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمار کیف آگیں
آرزو ، خواب ، تیرا روئے حسیں

نظم''انجام'' میں:

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں

پھر اوٹ لے کے دامن ابر بہار کی
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم

(مرگِ سوزِ محبت)

ان نظموں میں منظر نگاری کے باوجود جس اختصار سے کام لیا گیا ہے وہ فنی اعتبار سے بے حد بلند ہے۔'مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو'۔'تہہ نجوم' استفہامیہ اور تین منظر بھی جذبات کی مصوری کی عمدہ مثالیں ہیں۔''مرگِ سوزِ محبت'' میں ایک کشمکش کے بعد وہ اعلان کرتے ہیں کہ:

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

''میرے ندیم'' استفہامیہ نظم ہے۔ وہ سوالیہ نشان قائم کرتے جاتے ہیں۔ شاعر حیرت زدہ ہے کہ وہ احساسات وہ آرزوئیں کیا ہوئیں جن سے شعر کی دنیا آباد تھی۔ جن سے فکر وعمل رنگین تھی جس کے نور سے مہ وانجم شاداب تھے۔ جن سے جنونِ عشق کی ہمت جواں تھی۔'میرے ندیم' تجسس پر ختم ہوتی ہے۔ وہ اگلی محبتوں کے مزار پر چراغاں کر کے دبے پاؤں نکل جاتے ہیں:

چلو کہ چل کے چراغاں کردیں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار

فیض کی شاعری ایک ایسی فضا میں پہنچاتی ہے جس میں ہندوستان کے نوجوانوں کی تنہائی' بے یقینی' جانبازی' بے جہتی سبھی کچھ تھا۔ یہ بڑی غم گسار فضا تھی۔'میرے ندیم' ہی وہ نظم ہے جہاں فیض شاعرِ محبت سے شاعرِ انسان بن جاتے ہیں۔ اب تک ان کی نگاہوں نے بقول۔ ن۔ م راشد:

''صرف حریری گلابی ملبوسوں میں لپٹی ہوئی خواب سے چور اور لذت سے سرشار تصویریں ہی دیکھی تھیں لیکن اب وہ ان مناظر کی طرف بڑھتا ہے جو تلخ ہیں جن میں ملبوس کی سرسراہٹ اور خواب کی ضیا پاشیاں نہیں بلکہ زندگی کی تڑپ اور پکار ہے۔''

بے خواب کواڑوں کو مقفل کرنے کے بعد نئے دروازے دوسری شاہراہ پر کھلتے ہیں۔ وہ شاہراہیں جہاں رنگین وحریری ملبوسات ہیں' نہ کیف شراب نہ خمارِ خواب سے لبریز آنکھیں نہ رخساروں کے عشرت آلود غازے نہ سرخ ہونٹوں پہ تبسم کی ضیا' نہ مرمریں ہاتھوں کی لرزشیں نہ مخملی بانہیں اور جھلکتے ہوئے آنچل ہیں۔ یہ شاہراہ بدنما اور ٹھوس ہے۔ یہاں خاک وخون میں لتھڑے ہوئے اور نہائے ہوئے جسم' بازاروں میں مزدوروں کا بکتا ہوا گوشت' بھوک اگانے والے کھیت' ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹتے ہوئے عقاب' آرزؤں کی مقتل گاہیں' اجنبی ہاتھوں کا بے نام ستم' دلوں کی بے سود تڑپ اور جسموں کی مایوس پکار ہے۔

اس نئے دور کی پہلی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' ہے۔ شاعر اپنی ناسمجھی کا اعتراف کرتا ہے کہ اس نے محبوب کے وجود کو' محبوب کی صورت کو اور اس کی آنکھوں کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔ اپنے محبوب کا حصول ہی اس کی منزل تھی لیکن اسے احساس ہو چلا ہے کہ:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اب وہ زندگی کی بدنما حقیقتوں سے آنکھیں نہیں چرا سکتا۔

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

....

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجیے

شاعر اب اطلس وکمخواب سے خون' پیپ' امراض اور ناسوروں کی دنیا میں آتا ہے۔ نظم ''کیا کیجیے'' شاعر کی مجبوری کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ ناگزیر ہے۔ وہ حسن کا قدرداں ہے۔ وہ دنیا کی تلخ حقیقتوں سے گھبرا کر بند کواڑوں پر دستک دیتا ہے۔ وہ موت وزیست کی صف آرائی' شہر کی فراواں مخلوق کے باوجود کسی شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں اور جسم کے دل آویز خطوط بھی نہیں بھولتا۔ وہ شام کی سلگتی ہوئی اداسی میں چشمۂ مہتاب سے دھلی ہوئی رات کا حسن فراموش نہیں کرتا۔ وہ سوچتا ہے:

آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

پھر وہ عالم خیال سے افکار کی دنیا میں آتا ہے اور صدیوں سے آدم وحوا پہ جو گزر رہی ہے اسے سوچ کر تڑپ اٹھتا ہے:

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جو بن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

پھر وہ گھبرا کر حسن وعشق کی دنیا میں پناہ ڈھونڈتا ہے:

یہ بھی ہیں ' ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے دل آویز خطوط!
آپ ہی کہیے ' کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

....

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

(موضوعِ سخن)

''چند روز اور مری جاں فقط چند روز'' ان کی پہلی سیاسی نظم ہے۔ اس نظم میں انھیں ظلم وستم کا شعور ہے جو ہندوستان کی سیاسی تحریکوں پر ڈھایا گیا۔ انھیں یقین ہے کہ ظلم کی یہ زنجیر ٹوٹ کر بکھر جائے گی:

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارِ ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

بے شمار زخموں اور ناکامیوں کے باوجود فیض کو ایک نئی صبح کی آمد کا پورا یقین ہے۔ ''اے دل بے تاب ٹھہر'' میں ان کی امیدیں قوی ہو جاتی ہیں۔

یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے کو ہے اے دل بے تاب ٹھہر
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اٹھ جائے گی
یہ گراں بارئ آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی ' چھنکتی ہی رہے

نظم ''سوچ'' میں وہ کہتے ہیں

چھوڑو میری رام کہانی میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

وہ غم جاناں سے غم دوراں کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔

میرا دل غمگیں ہے تو کیا　　غمگیں یہ دنیا ہے ساری

فیض سکھ کے سپنے دیکھنے سے پہلے سب کے غم اپنانا چاہتے ہیں۔ ان کے یہاں سرمایہ داری کے خلاف جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سرمایہ داروں کے سکھ سارے انسانوں میں تقسیم ہو جائیں۔ لیکن انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے لمبی جنگ کرنی پڑے گی۔ قربانیاں دینی پڑیں گی۔

بے فکرے دھن دولت والے　　یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں ؟
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں　　یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں
ہم نے مانا جنگ کڑی ہے　　سر پھوٹیں گے، خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے　　ہم نہ رہیں، غم بھی رہے گا

یہ فیض کی شاعری کی نئی آواز ہے جو نئی سمت کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن یہ آواز نہ تو کرخت ہے اور نہ ہی اس میں گھن گرج ہے۔ فیض نے اپنے دل میں مچلتے ہوئے انقلابی نعروں کو شگفتگی اور نرمی عطا کی۔ یہ نرمی اور گداز اس لیے پیدا ہوا کہ غم محبت نے ان کی فکر کو غم حیات سے روشناس کروایا۔ انفرادی محبت کی حدیں اجتماعی درد سے جاملتی ہیں۔ فیض نے رقیب کو ایک نئے معنی دیے۔ وہ رقیب میں درد مشترک تلاش کرتے ہیں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرماں کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے

نظم ''کتے'' میں وہ ہندوستانیوں کو ذلت کا احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں جو انگریزوں کی غلامی کی زنجیریں توڑنے سے قاصر تھے اور انتہائی لاچاری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگر عوام متحد ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو مضبوط سے مضبوط حکومت کی بنیادیں ہلا سکتی ہیں۔ فیض نے راندہ درگاہ کتے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کتے مظلوم مخلوق کی علامت ہیں۔

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی ان کو احساس ذلت دلادے
کوئی ان کی سوئی ہوم دم ہلادے

''کتے'' کے علاوہ 'بول' بھی ان نظموں میں سے ہے جن میں رمز و کنایہ کے پردے میں فیض نے عزت نفس جگانے کی کوشش کی ہے:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے

دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

لیکن مسلسل جدوجہد کے بعد آزادی آئی تو شاعر نے دیکھا

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

یہ آزادی فیض کی منزل نہیں تھی

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

(صبح آزادی، اگست 47ء)

فیض جانتے ہیں کہ حق و باطل کی اس جنگ میں سر پھوٹیں گے، خون بہے گا۔ وہ خاک نشینوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

(ترانہ)

فیض راولپنڈی سازش کیس کے تحت 9 مارچ 1951ء کو گرفتار ہوئے اور اپریل 1955ء تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ 'دست صبا' اور 'زنداں نامہ' ان ہی دنوں کی یادگار ہیں۔ ان دونوں مجموعوں میں فکر کی گہرائی اور فن کا کمال ہے۔ جیل کے اندر کی دنیا، تنہائی، باہر کی دنیا کا تصور ایک نیا شعور پیدا کرتا ہے۔ فیض ابتدا میں سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں تھے اور تین مہینے قید تنہائی میں کاٹے۔ کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، رسائل، اخبار، خطوط کسی چیز کی اجازت نہیں تھی۔ بڑی اذیت کا دور تھا۔ لیکن فیض کے یہاں کوئی تلخی نہیں آئی۔ انھوں نے کہا:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ ٔ زنجیر میں زباں میں نے

....

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہہ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم

(طوق دار کا موسم)

قید کے زمانے میں فیض نے بہترین شاعری کی۔ وطن کی پکار، غریبوں کی آہیں، مظلوموں کی تڑپ، آنے والے دور کی آہٹیں سب کچھ انھوں نے محسوس کیا۔ حب الوطنی اور سوز عشق ایک ہو گئے۔ وطن کا تصور، محبوب کے پیکر میں ڈھل گیا:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

وہ کہتے ہیں

بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

(نثار میں تیری گلیوں کے.................)

اور نظم ''یاد'' میں بھی وطن اور محبوب ایک ہو جاتے ہیں

اس قدر پیار سے اے جان جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

فیض کا تعلق مزدور تحریک سے تھا۔ جیل میں رہ کر بھی فیض ایسا محسوس کرتے تھے جیسے وہ جیل کے باہر محنت کشوں کے ساتھ قدم ملا کر چل رہے ہوں۔ وہ مفلس، نادار، مفلوک الحال، غریب اور محنت کش عوام سے مخاطب ہو کر نظم ''شیشوں کا مسیحا'' کوئی نہیں'' ۔ لکھتے ہیں:

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یہ شیشے دراصل عزت و ناموس اور خواب ہیں۔ فیض کہتے ہیں ان شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں ہے۔ ان ٹکڑوں کو جوڑنے والا کوئی نہیں۔ فیض دونوں طبقات کا تقابل کرتے ہیں ایک وہ جن کے پاس سب کچھ ہے اور جو اپنی دولت پر پردے لٹکائے بیٹھے ہیں۔ دوسرے وہ جوان پردوں کو نوچ گراتے ہیں۔ یہ کشمکش جاری ہے۔ دونوں میں گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ فیض کہتے ہیں کہ اپنا حق چھین کر حاصل کرنا چاہیے۔ ساری نظم رمزیہ پیرائے میں ہے اس میں کوئی سیاسی نعرہ نہیں ہے۔

مارچ 1954ء میں فیض کو تین ہفتوں کے لیے لاہور جیل لایا گیا۔ فیض کو لاہور سے بے حد پیار تھا۔ انھوں نے نظم ''اے روشنیوں کے شہر'' لکھی ۔فیض کی شاعری جذبے' فکر' داخلیت و خارجیت کے امتزاج اور توازن کی حیرت انگیز مثال ہے۔ فیض کا مسلک محبت ہے۔ وطن سے محبت' بنی نوع انسان سے محبت! اس کے علاوہ درد بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ فیض نے اپنی مشہور نظم ''ملاقات'' منٹگمری جیل میں کہی۔ اس نظم میں پہلے شاعر رات کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ رات کو شجر کی علامت بناتا ہے تاکہ زندگی قابل برداشت ہو جائے۔ پھر ملاقات ایک قوت بن جاتی ہے جو درد کے رشتوں کو استوار کرتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ الم نصیبوں' جگر فگاروں کی صبح افلاک پر نہیں بلکہ زمین پر ہے۔

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں

اس نظم میں فیض نے خوبصورت استعارے استعمال کیے ہیں۔ یہ نظم معریٰ (Bland Verse) ہے۔ منٹگمری جیل میں انھوں نے ''دریچہ'' اور ''درد آئے گا دبے پاؤں'' جیسی نظمیں لکھیں۔ جیل میں ہی جب ایتھل اور جولیس روزن برگ کی شہادت کی خبر ملی تو فیض نے اپنی مشہور نظم ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' کہی۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''فیض دیکھ رہے تھے کہ ظلم و استبداد کے خلاف یہ حشر خیز تحریکیں صرف ان کے وطن میں نہیں ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں سر اٹھا رہی ہیں۔ انھوں نے ساری دنیا کے حریت پسندوں باغیوں کی جدوجہد سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا۔ اپنی نظم ''آ جاؤ افریقا'' میں انھوں نے کینیا اور دوسرے آفریقی ملکوں کے حریت پسند عوام کی آواز سے آواز ملائی ہے۔ ایران کے قید خانوں میں وطن پرست نوجوان شاہ کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ (شبستاں' فیض نمبر ص 67)

''سر وادیٔ سینا''۔ ''فلسطینی بچے کے لیے لوری''۔ ''فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے'' جیسی نظمیں لکھیں۔ فلسطین فیض کا وطن ثانی تھا۔ وہ اس کا ذکر بڑے دکھ اور پیار سے کرتے ہیں:

میں جہاں پر بھی گیا ارض وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے

جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارض فلسطیں کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

''ایک ترانہ مجاہدین فلسطین کے لیے'' میں انھیں جیت کا یقین ہے:

ہم جیتیں گے
حقا کہ ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے

فیض اقتصادی بربادی یا معاشرتی الجھاد کو اپنا موضوع نہیں بناتے۔ جس چیز کا احساس فیض کو سب سے زیادہ ہے وہ سیاسی غلامی اور ظلم واستبداد کا آہنی پنجہ ہے۔ فیض نے اپنی شاعری کے ذریعہ ظلم کو ظلم اور ستم کو ستم کہنے کا سلیقہ سکھایا' افکار کی جرات عطا کی' مشاہدہ حق کی گفتگو میں حسن کی لطافتوں کا رنگ بھر کے گفتگو کو زیادہ با معنی' دلکش اور پر اثر بنا دیا۔ ان کے کئی اشعار ضرب المثل بن گئے۔ فیض نے احتجاج کے ساتھ دعا بھی کی۔ یہ دعا بھی ان کے خیالات کی ترجمانی کرتی ہے:

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسم دعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوز محبت کے سوا
کوئی بت کوئی خدا یاد نہیں

(دعا)

فیض سوز و محبت کے شاعر ہیں۔ ان کا یہ سوز درد کے رشتے میں ڈھل کر آفاقی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ فیض کو یقین ہے کہ آخر کار خلقِ خدا کا راج ہوگا۔ نظم'' **ویبقیٰ وجہ ربک** '' میں وہ کہتے ہیں۔

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے

وہ کہتے ہیں کہ وہ دن آئے گا جب ظلم وستم کے کوہ گراں روئی کی طرح اڑ جائیں گے اور محکوموں کے پاوں تلے دھرتی دھڑ دھڑ کے گی' اہل حکم کے سر کے اوپر بجلی کڑ کے گی اور ارض خدا کے کعبے سے سب بت اٹھوائے جائیں گے اور ہم اہل صفا' مردودِ حرم مسند پہ بٹھائے جائیں گے۔ وہ آگے چل کر کہتے ہیں:

سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اور راج کرے گی خلق خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

فیض کا اپنی شاعری کے بارے میں یہ کہنا پوری طرح سچ ثابت ہوتا ہے کہ:

ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے

26.4.1 اسلوبِ سخن

فیض کی شاعری میں عاشق و مجاہد کی کشمکش ہے۔ ان کی شاعری روایت و اجتہاد کی بہترین مثال ہے۔ فیض نے پرانی علامتوں کو نئی معنویت دی ہے۔ صیاد، اہل قفس، گلچیں، قاتل، مقتول، اہل ستم، دار و رسن، شام و سحر اور وصل و ہجر کا استعمال انھوں نے خاص سماجی تناظر میں کیا اور نئے مفاہیم کے ترجمان بن گئے۔ فیض نے جو پیکر تراشے ہیں وہ ان کے منفرد طرز ادا کی غمازی کرتے ہیں۔ زبان کے نئے سانچے انھوں نے اردو شاعری کو دیے ہیں۔ ''بے صبر خواب گاہیں''۔ ''اجنبی بہاریں''۔ ''ترسی ہوئی شب''۔ ''بیزار قدم''۔ ''ہونٹوں کے سراب''۔ ''ناکام نگاہیں''۔ ''خوابیدہ راحتیں''۔ ''منتظر راہیں''۔ ''جھلسی ہوئی ویرانی''۔ ''بے خواب کواڑ''۔ ''درد کے فاصلے'' وغیرہ۔ فیض کے پاس بے پناہ تراکیب ہیں۔ فیض کے یہاں بے شمار خوبصورت تشبیہات ملتی ہیں چند مثالیں دیکھیے:

سرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

....

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے

....

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

اسلوب کے اعتبار سے فیض کی شاعری قدیم و جدید میلانات کا دلکش آمیزہ ہے۔ قدیم شاعری سے جہاں انھوں نے گھلاوٹ، جذباتی کسک، انسان دوستی، نغمگی اور فنی رچاؤ لیے وہیں عالمی ادب کے جدید رجحانات اور انگریزی رومانی شاعری کے اثرات بھی قبول کیے۔ فیض کی شاعری فلسفے کے بوجھ تلے دبی ہوئی نہیں ہے لیکن اس پر ایک مخصوص نظریے کی مہر لگی ہے۔ ان کی موضوعاتی شاعری میں تلخی حیات اور تلخی حالات کا ذکر ہے لیکن جھنجھلاہٹ اور زندگی سے بے زاری کا احساس نہیں ملتا۔ فیض کے یہاں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت اور اعتدال پسندی ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کے ایک بحرانی دور میں انفرادیت برقرار رکھی۔ فیض کی شاعری میں ان کے عہد کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اس میں ان کی ذات اور اس عہد کا شعور موجود ہیں۔ عصری حسیت اور عرفان ذات دونوں نے فیض کی شاعری کو تقویت بخشی ہے۔ اسی میں ان کی انفرادیت ہے اور فیض کا فن پوری نسل کو متاثر کرتا ہے۔ فیض کے یہاں خارجی زندگی کے تجربے شخصی واردات بن کر اجاگر ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بشارتِ سحر اور نوید بہار کا تصور ملتا ہے۔ فیض انسانیت کے درخشاں مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ فیض کہتے ہیں:

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فیض کی نظموں کے موضوعات کیا کیا ہیں؟
2. فیض نے زنداں میں کون کون سی نظمیں لکھیں؟
3. فیض کے اسلوب کی خوبیاں بیان کیجیے۔

26.5 نظم: مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت، مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا کہ جو تو ہے، تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے، تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے، تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا، یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بہ جا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے، خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر، کیا کیجیے؟
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجیے؟
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

26.5.1 مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ کا تجزیہ

یہ نظم فیض کے پہلے شعری مجموعے ''نقش فریادی'' سے لی گئی ہے۔ یہ نظم فیض کی شاعری میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مرکزی خیال اردو شاعری میں ایک اہم رجحان بن گیا۔ فیض آخر تک عشق اور انقلاب کے نقیب رہے۔ ایک عاشق اور مجاہد کی کشمکش میں مبتلا رہے لیکن اس نظم سے وہ رومانی فضا کے اثر سے نکل آئے۔ یہیں سے ان کا سفر شدید داخلیت سے خارجیت کی جانب گامزن ہوا۔ یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ نئے شعرا غم دوراں کو غم جاناں کی شدت میں کمی کا جواز ٹھہرنے لگے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

> ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' سے فیض کے یہاں دو قسم کی تبدیلیاں ہوتی ہیں پہلی یہ کہ رومان اور خالص جمالیاتی اقدار کے علاوہ زندگی کی دوسری قدریں بھی ان کے یہاں ابھرنے لگتی ہیں۔ دوسری یہ کہ

حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر کی وجہ سے رخِ محبوب کے سیال تصور کی مثالیت ختم ہونے لگتی ہیں۔

(دھنک رنگ لمحوں کا شاعر۔ فن اور شخصیت۔ فیض نمبر ص 92)

یہ نظم تین بند اور بیس مصرعوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک سادہ بیانیہ اور پابند نظم ہے۔ نظم مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ سے شروع ہوتی ہے اور اسی مصرعے پر ختم ہوتی ہے۔ تین بند چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ پھر دو مصرعے ہیں آخری اور چوتھا بند چار مصرعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں شاعر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ اپنے محبوب ہی کو سمجھا تھا۔ محبوب کے وجود سے اس کی حیات درخشاں تھی۔ محبوب کا غم ہی سب کچھ تھا' اس غم میں اس نے دنیا کے سارے غم بھلا دیے تھے۔ اس کی صورت سے سارے عالم میں بہار تھی اور پھر وہ اپنے محبوب کی آنکھوں کو دنیا کی سب سے قیمتی شئے سمجھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے سوا دنیا میں کچھ بھی نہیں رکھا ہے۔ دوسرے بند میں وہ پہلے بند کے تسلسل میں کہتا ہے کہ اپنے محبوب کا حصول اس کے لیے تقدیر کا سب سے بڑا عطیہ تھا۔ جیسے اس نے تقدیر کو جھکا دیا اس پر فتح پالی ہو۔ ایسا ہوا تو نہیں لیکن شاعر کی شدید خواہش تھی کہ ایسا ہو جائے۔ اس کے بعد دو مصرعوں میں شاعر گریز کرتا ہے۔ یہ نظم کا انتہائی اہم موڑ ہے۔ یہاں سے شاعر اپنی محبت کی دنیا سے نکل آتا ہے۔ اس کی نظر محبوب کے وجود سے ہٹ کر دوسری طرف منعطف ہوتی ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ محبت کے غم کے علاوہ دنیا میں بے پناہ غم بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وصل کی راحت ہی سب کچھ نہیں ہے۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اگلے بند میں نظم کا موڈ بالکل بدل جاتا ہے۔ گرہ کھلنے لگتی ہے کہ شاعر کے خیالات میں یہ تبدیلی کیوں آئی۔ شاعر محسوس کرتا ہے کہ صدیوں سے ظلم ہو رہا ہے۔ ایک تاریک بہیمانہ طلسم ہے جس میں انسان گرفتار ہے۔ انسانی جسم کو ریشم' اطلس و کمخواب میں لپیٹ کر کوچہ و بازار میں جا بجا بیچا جا رہا ہے۔ فیض کا اشارہ جسم فروشی کی طرف ہے۔ جو صدیوں سے جاری ہے۔ سماج میں بھوک ہے بیماری ہے۔ لاکھوں لوگوں کے پاس نہ روٹی ہے اور نہ دوا امراض ہیں...... ناسوروں سے پیپ بہہ رہی ہے۔

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

"اگر یہ اشعار جوش کے قلم سے ٹپکتے تو دھچکا نہ لگتا کیوں کہ ان کی بغاوتوں کے ہم عادی رہے ہیں لیکن فیض کے یہاں غازۂ رخسار اور ضیائے تبسم کے ساتھ خون اور پیپ کا تصور! بہت سے شاعر اور نقاد چیخ اٹھے۔ وہ تو خود ہی فیض نے جب نظم کے خاتمہ پر اس کا ازالہ اس طرح کیا ہے کہ:

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے

تو ایک گونہ تسلی ملی۔ لیکن یہیں سے فیض کی یک رنگ شاعری میں دوسرے رنگ کا تار ملتا ہے۔ اس نئے شعور نے فیض کا تصورِ محبت ہی بدل دیا۔

(فن اور شخصیت: فیض نمبر ص 93-92)

حمید نسیم اس بند کو سیاسی نعرے سے تعبیر کرتے ہیں لیکن وہ بھی اس بات سے متفق ہیں کہ اگلا مصرعہ اس کا ازالہ کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگلا بند اساسی طور پر نعرہ ہے۔ مگر شاعر نے اسے نعرہ کی سطح سے اٹھا کر جمال کا پیرہن عطا کر دیا ہے۔ پھر دوسرے بند کے آخری مصرعے دہرا کر نظم Climax پر پہنچ جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر دوسرے بند کے اختتام پر نظم ختم کر دی جاتی تو اس تکرار سے بچ جاتی اور تاثر شاید ان ہی کے باعث شدید تر ہوتا۔

(پانچ جدید شاعر: ص 32-31)

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے

یہ مصرعے شاعر کی کشمکش کا اظہار کرتے ہیں۔لیکن تین مصرعوں کو دہرا کر شاعر اس بات پر مہر ثابت کرتا ہے کہ وہ غم جاناں سے غم دوراں کی طرف آ گیا ہے۔اور اس کے پاس غم دوراں کی زیادہ اہمیت ہے۔وہ اس بات کو سمجھنے لگا کہ انفرادی دکھ اور سکھ اور راحتوں سے ہٹ کر کچھ اور دکھ ہیں جو کہیں زیادہ اہم ہیں اور فوری توجہ چاہتے ہیں۔کیا کیجیے میں غیر ارادی پن جھلکتا ہے۔شاعر انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔فیض کی یہ الجھن اور کشمکش حقیقی تھی اس لیے اس نظم میں تاثر کی شدت پائی جاتی ہے۔پہلا مصرعہ ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔پھر وہ نظم میں کھوتا چلا جاتا ہے۔اس نظم میں فیض ''پیپ اور گلتے ہوئے ناسوروں'' کا ذکر کرتے ہیں جس سے جمالیاتی احساس کو ٹھیس پہنچتی ہے بعد میں فیض نے ایسی لفظیات کو ترک کر دیا۔فیض کی شاعری میں رومان اور انقلاب کے درمیان کشمکش اور ذہنی الجھن کا سلسلہ اسی نظم سے شروع ہوتا ہے۔یہ نظم خیال، جذبے اور احساس کا ایسا دائرہ بناتی ہے جس میں قاری محصور ہو جاتا ہے۔اس کے کئی مصرعے زبان زد خاص و عام ہو گئے۔جیسے

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

....

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

فیض کی یہ ایک اہم نظم ہے جو ان کی شاعری کے مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ .... بند .... مصرعوں پر مشتمل ہے۔
2. یہ نظم جس مصرعے سے شروع ہوتی .... مصرعے پر ختم ہوتی ہے۔
3. اس نظم کا زبان زد خاص و عام شعر کون سا ہے؟

26.6 نثار میں تری گلیوں کے ....

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد
بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں
یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے
گر آج تجھ سے جدا ہیں، تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا؟
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

26.6.1 نثار میں تری گلیوں کے......کا تجزیہ

یہ نظم فیضؔ کے دوسرے شعری مجموعے ''دست صبا'' سے لی گئی ہے۔ فیضؔ نے یہ نظم قید کے دوران لکھی۔ نظم سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر قید ہے اور اپنے وطن کی گلیوں کے تصور میں غرق ہے۔ یہ نظم چار مصرعوں کے پانچ بند پر مشتمل ہے۔ ہر بند کے بعد دو مصرعے ہیں۔ پہلے بند میں شاعر اس ڈکٹیٹر شپ کے بارے میں اظہار کرتا ہے جہاں سخت پابندی ہے۔ کسی کو سر اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ جہاں اختلاف رائے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہر نقل وحرکت پر پابندی ہے۔ اپنے وطن میں آزادانہ گھومنے پھرنے کو بھی مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اہلِ دل اور اہلِ نظر پر سخت پابندی ہے۔ پتھر مقید ہیں اور کتے آزاد ہیں۔ پتھر سے مراد وہ جو حق کی بات کرتے ہیں اور ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ دم ہلانے والے بات بے بات غرانے والے آزاد ہیں۔ جو وطن کی بھلائی چاہتے ہیں ان پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ اہل ہوس ہی مدعی بھی ہیں اور منصف بھی۔ دعوی کرنے والے بھی اہل ہوس ہیں اور انصاف کرنے والے بھی وہی ہیں۔ ایسے میں اپنی بات پہنچانا اور انصاف کی توقع رکھنا فضول ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ فیضؔ کی نظم کا یہ بند ایسا ہے جہاں وطن کی محبت اور محبوب کا تصور ایک ہو جاتے ہیں۔ شاعر چار دیواری میں قید ہے۔ صرف زنداں میں ایک روزن ہے۔ جب روشن داں اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اب رات ہو چکی ہے اور وطن کی مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی اور جب روزن سے آتی شعاعوں سے زنجیریں چمکنے لگتی ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ صبح ہو چکی ہے۔ اور وطن کے چہرے پر سحر نے اپنا نور بکھیر دیا ہوگا۔ یہ وطن بھی ہو سکتا ہے اور محبوب بھی۔ یہاں وطن اور محبوب کا تصور گھل مل جاتے ہیں۔ شاعر شام وسحر اسی تصور میں گزار رہا ہے۔ اسی تصور میں وہ در و دیوار کے سائے میں زندہ ہے۔ اسی امید نے شاعر کو زندہ رکھا ہے۔ اگلے بند میں شاعر کہتا ہے۔ ظالم اور مظلوم کا یہ ٹکراؤ نیا نہیں ہے۔ ظالم سے خلق ہی الجھتی ہے۔ عوام ہی انقلاب کے نقیب ہوتے ہیں۔ صدیوں سے یہی ریت ہے۔ صداقت اور حق کی بات کرنے والوں پر ظلم کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ انھیں مصلوب کر دیا جاتا ہے۔ ان کی راہوں میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں۔ طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ آگ میں پھول کھلانے کی تلمیح ابراہیمؑ سے وابستہ ہے۔ ابراہیمؑ نے حق کے لیے آتش نمرود میں

چھلانگ لگائی تھی اور آگ گلزار ہوگئی تھی۔ حق و باطل کی یہ کشمکش صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ لیکن شاعر کو یقین ہے کہ آخر میں جیت حق و صداقت کی ہوتی ہے۔ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے۔ اہل حق کا یہی اطمینان انھیں ہر ظلم برداشت کرنے کی طاقت بخشتا ہے۔ فیض کہتے ہیں یہی بات انھیں حوصلہ عطا کرتی ہے اور وہ خدا سے گلہ نہیں کرتے۔ اور یہ جو فراق ہے۔ وطن سے جو دوری ہے' قید کی جو زندگی ہے اس کی وجہ سے دل بُرا نہیں کرتے کیوں کہ کامیابی یقینی

فیض کو اپنی کامیابی پر کامل یقین ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ رات بھر کی جدائی ہے اس کے بعد صبح نو طلوع ہوگی۔ رات' ظلمت کا استعارہ ہے۔ وہ کہتے ہیں ظلم ہمیشہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس لیے یہ جو وطن سے جدائی ہے وہ عارضی ہے۔ آنے والے کل وہ وطن میں ہوں گے۔ یعنی پھر سے ان کی مصروفیات شروع ہو جائیں گی...... وہ جانتے ہیں کہ دشمن کا آج عروج ہے۔ لیکن یہ عروج ہمیشہ نہیں رہے گا۔ بس یہ چار دن کی جدائی ہے۔ اور خدائی بھی چار روزہ ہے۔ اس لیے وہ وطن سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں۔ اور ایک امید افزا صبح کے تصور میں دن رات گزارتے ہیں۔

فیض کا ایقان صبح نو پر ہے۔ ایک انقلاب کی امید ہے۔ یہی امید انکی شاعری کو ایک نئی قوت بخشتی ہے اور یقین کو بلند سطح پر پہنچاتی ہے۔ اس نظم میں بیانیہ اور علامتیں ساتھ ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ فیض کی یہ نظم بیانیہ ہوتے ہوئے بھی راست اظہار کی حامل نہیں ہے۔ جسم چرانا' سنگ وخشت' سگ اہل جنون' اہل ہوس' مدعی' منصف' آگ میں پھول' رقیب وغیرہ خوب صورت اشارہ بن گئے ہیں۔ وطن کی محبت اور تڑپ کا اندازہ اس نظم سے ہوتا ہے۔

فیض کی شاعری میں گھن گرج اور نعرہ بازی نہیں ملتی۔ وہ ذہنی توازن نہیں کھوتے۔ قید و بند سے گھبراتے نہیں۔ انھیں اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ وہ قید میں ہیں اور اس طرح تحریکوں میں حصہ نہیں لے سکتے ہیں لیکن یہ پختہ یقین بھی ہے کہ صورت حال بدلے گی اور ظلم کا دور ختم ہوگا۔ لہجے کا دھیما پن اور یقین کی پختگی ان کی شاعری کو منفرد بناتی ہے۔ فیض کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ یہ نظم بھی اپنے عصر کی عکاسی کرتی ہے۔ ساتھ ہی فیض کے جو دل میں گزرتی ہے وہ بھی رقم کرتے جاتے ہیں۔ فیض کی آپ بیتی' جگ بیتی بن جاتی ہے۔ فیض کی شاعری میں درد کی ایک زیریں لہر بہتی ہے۔ اس نظم میں بھی اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر سلامت اللہ خاں لکھتے ہیں:

> ''فیض کی شاعری میں ایسا حزن و ملال' ایسا درد و الم' ایسی غم انگیزی ہے جس میں ہارڈی یا فانی کی قنوطیت کی خنکی نہیں بلکہ جو حسین ہے' جو پراسرار ہے۔ جو خواب آور ہے جو جمالیاتی لذت سے چور ہے۔ فیض کی آنکھیں فکر مند بھی ہیں اور درد مند بھی ...... لیکن جس چیز کا ہمیں شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ ان کی آنکھیں منتظر بھی ہیں آنے والے محبوب کی...... کسی رنگین آنچل کی۔ گھنے درختوں پر تھکی ہوئی' سوئی ہوئی چاندنی کی۔ سرگوشیوں کی۔ ایک الجھے ہوئے موہوم سے درماں کی اور اس عہد نو کی جس پر انھیں یقین ہے۔''

(فیض احمد فیض۔ تنقیدی جائزہ' ص 147)

فیض کی اس نظم کے اشعار بھی زبان زد خاص و عام ہوئے۔ خاص طور پر یہ شعر:

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں' کس سے منصفی چاہیں

فیض کی یہ نظم ان کی حب الوطنی کی روشن مثال ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اس نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟

الف) وطن کی جدائی عارضی ہے آنے والا کل آزادی کی بشارت لائے گا۔

ب) وطن سے جدائی دائمی ہے اور قید خانہ ہی شاعر کا مقدر ہے۔

ج) شاعر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔

2. سنگ وخشت مقید ہیں اور............آزاد (سگ' چور' شجر)

3. کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں۔ مصرعہ اولیٰ کیا ہے؟

الف) بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جُو کے لیے

ب) چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

ج) بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی

26.7 نظم: شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انھیں ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی، بہادی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
ان شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

ناداری، دفتر، بھوک اور غم
اُن سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذروں میں کہیں
موتی ہے تمھاری عزت کا
وہ جس سے تمھارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا

اُس مال کی دُھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر، یاں مفلس کی
گر جان بچی، تو آن گئی

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں، تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں، تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے؟
اک بخیہ اُدھیڑا، ایک سیا
یوں، عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کارگہہ ہستی میں جہاں یہ ساغر، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے سب دامن پر ہوسکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے، یاور ہے یہاں جو آنکھ اٹھے، وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ، مگر

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ جو ہیں اس دولت پر پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو، ہر ساگر کو نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں، جو لڑ بھڑ کر یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے پر ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر اسی بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو اس رن سے بلاوے آتے ہیں

26.7.1 نظم: شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کا تجزیہ

فیض کی یہ نظم ان کے دوسرے شعری مجموعے ''دست صبا'' سے لی گئی ہے۔ یہ فیض کی طویل نظم ہے جو انیس بندوں اور 76 مصرعوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظم طبقاتی جنگ میں جو ہر جگہ لوٹنے والوں اور ''لٹے ہوؤں'' کے درمیان جاری ہے اس میں شرکت کی دعوت ہے۔

پہلے بند میں شاعر کہتا ہے کہ موتی ہو کہ شیشہ، جام یا دُر ایک بار ٹوٹنے کے بعد دوبارہ جڑ نہیں سکتے۔ ان کے ٹکڑے چن چن کر دامن میں چھپائے رکھنا بے کار ہے کیوں کہ کسی شیشے کے مسیحا کی توقع رکھنا فضول ہے۔ نظم آگے بڑھتی ہے تو ان شیشوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان شیشوں میں ''ساغرِ دل''۔ ''سپنے'' اور ''عزت'' ہیں۔ ساغرِ دل جس میں غم جاناں کی پری بڑے ناز سے اترا کرتی تھی اسے دنیا والوں نے پھوڑ ڈالا۔ رنگین سپنے جو مست جوانی میں دیکھا کرتے تھے وہ ناداری، دفتر، بھوک اور غم سے ٹکرا کے چور چور ہو گئے کیوں کہ چوکھ پتھراؤ تھا۔ اس کے سامنے کانچ کے یہ ڈھانچے بے بس تھا۔ شاعر کہتا ہے شیشے کے ان ٹکڑوں میں عزت کے موتی بھی ہیں۔ یہاں شاعر غریب کی عزت کو اہمیت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس عزت کو پانے کی کوشش نام نہاد قد آور شخصیتیں، تاجر اور رہزن کرتے ہیں۔ وہ اسی دھن میں پھرتے ہیں تا کہ وہ اسے پامال کرسکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ غریب کی اگر جان محفوظ بھی رہی تو اس کی آن باقی نہیں رہتی۔ فیض یہ واضح کرتے ہیں کہ دولت مند افراد کس طرح غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔ ان کا دل، ان کے خواب اور ان کی عزت کے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور یہ ٹکڑے چبھتے ہیں لہو رلواتے ہیں۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر اگر سالم ہوں تو ان کی قیمت ہے۔ ٹکڑوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں اس لیے ٹکڑوں کو دامن میں چھپا کر کسی مسیحا کی آس لگائے رکھنا فضول ہے۔

نظم ایک نیا موڑ لیتی ہے۔فیض کہتے ہیں یادوں کے سہارے کب تک زندہ رہا جا سکتا ہے۔یادوں کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے ایک بخیہ ادھیڑا ایک سیا۔ اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا اور نہ کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔فیض کہتے ہیں دنیا میں ہر شئے کا بدل مل سکتا ہے۔ہر دامن پر ہو سکتا ہے۔یہاں دولت کی کمی نہیں ہے۔اس میں شک نہیں کہ یہاں ڈاکو بھی گھات میں بیٹھے ہیں لیکن یہاں ہاتھ بڑھا کر اپنا حصہ چھیننا پڑتا ہے۔بقول شاد عظیم آبادی:

یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی

جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

یہاں صرف ہیرے اور موتی کی تلاش کی ضرورت ہے ورنہ پربت، ہیروں اور ساگر موتیوں سے خالی نہیں ہیں۔فیض کہتے ہیں کہ ایک طرف چور، ڈاکو، رشوت خور، اٹھائی گیرے اور وہ ہیں جن کے پاس مال و دولت عیش و آرام سب کچھ ہے۔دوسری طرف وہ ہیں جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ایک طرف وہ ہیں جنھوں نے دولت پر پردہ ڈال رکھے ہیں دوسری طرف وہ ہیں جوان پردوں کو نوچ گراتے ہیں۔ان دونوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑتا ہے۔یہ لڑائی بستی بستی نگر نگر ہو رہی ہے۔جن کے پاس سب کچھ ہے وہ کالک پوتتے پھرتے ہیں ہر راہ میں اندھیرا کر دیتے ہیں دوسری طرف جن کے پاس کچھ نہیں وہ انھیں راستوں پر جوت جگاتے ہیں وہ آگ لگاتے ہیں یہ آگ بجھاتے ہیں۔فیض کہتے ہیں اس لڑائی میں ساغر، شیشے، لعل و گہر بد جاتے ہیں۔اور آخری دو مصرعوں میں، وہ لوگ جو خالی ہاتھ ہیں ظلم و ستم کا شکار ہیں اس رن میں کود پڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔

نظیر صدیقی اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''فیض نے ایسے لوگوں کو جو یاس و حسرت کی زندگی بسر کرنے پر قانع ہو گئے ہیں ہستی کے اٹھائی گیروں سے لڑنے کی ترغیب جس انداز سے دی ہے یہ انھیں کا حصہ ہے۔اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سیاسی جدوجہد کی دعوت دینے کے باوجود سیاسی نعرہ زنی کو راہ نہیں دی گئی ہے۔ (عکس اور جہتیں۔ص 123)

فیض کی اس نظم میں بھی ایمائیت اور اشاریت موجود ہے۔چوتھے، چھٹے اور آٹھویں بند میں وہ سادہ بیانیہ سے کام لیتے ہیں۔کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ اس نظم میں صرف سات بند ہوتے تو نظم اچھی ہو سکتی تھی۔انھوں نے صرف ایسے بندوں کا انتخاب کیا ہے۔جن میں اشاریت ہے۔فیض نے رمز اور کنایے میں دولت مندوں اور ناداروں کے ٹکراؤ کو پیش کیا ہے۔نظم کی ایمائیت اور اشاریت جگہ جگہ مجروح ہوتی ہے۔فیض کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ دکھ اور مایوسی کے پیچھے ماحول کے دکھ درد کی کہانی ہوتی ہے۔فیض کی شاعری میں جہاں کرب کی گہرائی ہے وہیں ہمت اور عزم امید کی طرف لے جاتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. کون سے اشعار دہرائے گئے ہیں؟

الف) موتی ہو کہ شیشہ جام کہ در	جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
کیا اشکوں سے جڑ سکتا ہے	جو ٹوٹ گیا سو چھوٹ گیا
ب) تم ناحق ٹکڑے چن چن کر	دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں	کیا آس لگائے بیٹھے ہو
ج) سب ساغر شیشے لعل و گہر	اسی بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو! سب خالی ہاتھوں کو	اس رن سے بلاوے آتے ہیں

2. اس نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟

الف) لوٹنے والوں اور لٹے ہوؤں کے درمیان جنگ

ب) شیشوں، موتی اور دُر کا کاروبار

ج) شیشے کی دکانوں سے پردے گرانا

3. اس نظم کا لہجہ کیسا ہے؟ الف) کرخت ب) نعرہ بازی کا ج) اعتدال کا

26.8 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے فیض کی حیات، کارنامے اور ان کی نظم نگاری کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

فیض کا پورا نام فیض احمد خاں تھا۔ وہ 13 فروری 1911ء کو پیدا ہوئے۔ جائے پیدائش قصبہ قادر، ضلع سیال کوٹ ہے۔ اپنے والد کے زمانے میں انھوں نے بڑی خوش حال زندگی گزاری۔ فیض نے انگریزی اور عربی میں ایم۔ اے کیا۔ ان کا پورا تعلیمی کیریر فرسٹ کلاس ہے۔ فیض درس و تدریس سے وابستہ رہے پھر فوج میں ملازمت اختیار کی۔ انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز، امروز، لیل ونہار کے چیف ایڈیٹر رہے۔ قیام پاکستان کے تین برس بعد 1951ء میں راولپنڈی سازش کیس کے تحت گرفتار ہوئے۔ اپریل 1959ء میں رہائی ملی۔ فیض کا انتقال 20 نومبر 1984ء کو ہوا۔ نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہہ سنگ، سروادیٔ سینا، شام شہر یاراں، میرے دل میرے مسافر فیض کے شعری مجموعے اس کے علاوہ ان کے نثری مضامین، خطوط کے مجموعے اور سفرنامے بھی ہیں۔

فیض کی شاعری کی ابتدا 1928ء سے ہوئی۔ ان کی پہلی نظم ''میرے معصوم قاتل'' ہے۔ فیض نے ابتدا میں رومانی شاعری کی۔ لیکن بہت جلد وہ حقیقت کی طرف راغب ہوئے۔ فیض کی شاعری میں رومان و حقیقت کی دھوپ چھاؤں ابتدا سے انتہا تک ہے۔ وہ رومان اور حقیقت کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایک رہگذر پر، خدا وہ وقت نہ لائے، ''سرود شبانہ''، ''مری جان اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو''، ''میرے ندیم'' ان کی رومانی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں تنہائی اور انتظار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی دو نظمیں ''تنہائی'' اور ''انتظار'' کے عنوان سے بھی ہیں۔ فیض کی رومانی شاعری میں جدائی کی خاموش تڑپ ہے ''سرود شبانہ''، ''تہہ نجوم''، ''یاس'' اور ایک منظر فیض کی مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' میں فیض حقیقت کی طرف آتے ہیں۔ چند روز اور مری جاں فقط چند ہی روز'' ان کی پہلی سیاسی نظم ہے۔ ''اے دل بے تاب ٹھہر''۔ ''سوچ''، ''کتے''، ''بول''، ''صبح آزادی''، ''ترانہ'' ان کی سیاسی نظمیں ہیں۔ قید کے زمانے میں فیض نے بہترین شاعری کی۔ ''نثار میں تری گلیوں پہ''۔ ''یاد''، ''اے روشنیوں کے شہر''، ''ملاقات''، ''دریچہ''، ''درد آئے گا دبے پاؤں''، ''وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' یادگار نظمیں ہیں۔ فیض نے ظلم واستبداد کے خلاف جہاں بھی تحریکیں چلائی گئیں ان کی تائید کی اور ''آجاؤ افریقا''، ''سروادیٔ سینا'' جیسی نظمیں لکھیں۔ فیض کی شاعری میں قدیم و جدید میلانات کا دلکش امتزاج ملتا ہے۔ وہ کوئے یار سے سوئے دار تک سفر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سنت منصور و قیس ملتی ہے۔

26.9 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. فیض کی حیات اور کارنامے، پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. ''فیض کی رومانی شاعری میں تنہائی اور انتظار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں'' آپ اس خیال سے کس حد تک مطمئن ہیں؟ مدلل لکھیں۔
3. ''فیض نے انقلابی نعروں کو شگفتگی عطا کی'' اس خیال کی روشنی میں فیض کی سیاسی شاعری کا جائزہ لیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت ....'' کا تجزیہ کیجیے۔
2. نظم ''نثار میں تیری گلیوں کے'' کا مرکزی خیال تحریر کیجیے۔
3. فیض کی شاعری کی خصوصیات پر مختصر نوٹ لکھیے۔

26.10 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
اوج	=	اونچائی	بخیہ	=	پیوند	بست وکشاد	=	چھپا ہوا اور ظاہر
بلوریں	=	کانچ کا	بہیمانہ	=	سفاکانہ	دُر	=	موتی
تنور	=	چولھا۔جس میں دم دیا جاتا ہے	رَن	=	میدان جنگ	روزن	=	روشن دان
رہزن	=	راستے میں لوٹنے والا	سلاسل	=	زنجیر	سنگ وخشت	=	پتھر وا ینٹ
شہپر	=	چھت	شمشاد	=	ایک اونچا درخت	صہباغم	=	غم کی شراب
طالع	=	قسمت،نصیب	طواف	=	اطراف چکر لگانا	کارگہِ ہستی	=	دنیا
نگوں	=	جھک جانا	مدعی	=	دعویٰ کرنے والا	مسیحا	=	زندہ کرنے والا

26.11 سفارش کردہ کتابیں

1. خلیق انجم — فیض احمد فیض۔تنقیدی جائزہ
2. شاہد ماہلی — فیض احمد فیض۔عکس اور جہتیں
3. صابردت (مرتب) — فیض نمبر۔فن اور شخصیت
4. فیض نمبر شبستان۔دہلی
5. نمبر۔افکار۔کراچی